اشعر نجمی کے ناول "اس نے کہا تھا" شناخت، جبر اور عصری سماجی مسائل کا بیانیاتی مطالعہ

ڈاکٹر فضل کبیر لیکچرار، شعبہ اردو، اسلامیہ کالج یونی ورسٹی، پشاور
عدنان خان ایم فل اسکالر، شعبہ اردو، اسلامیہ کالج یونی ورسٹی، پشاور
ڈاکٹر سدرہ صادق لیکچرار، شعبہ اردو، اسلامیہ کالج یونی ورسٹی، پشاور

Abstract:

Ashar najmi ,a prominent modern novelist, skillfully explores complex themes in his work. his novel ''us ny kaha tha''delves into human life's intricacies, focusing on gender's impact on individuals and society. Najmi sensitively portrays the psychology of homosexuals and their relationship, as well as the challenges faced by transgender individuals. The novel also addresses homosexuality, child sexual abuse, and their profound effects. Additionally, it touches on the emotional and psychological to all of India, partition. Overall, najmi,s work provides a comprehensive look at human sexuality, LGBTQ psychology, and social status.

Key Words: Modern Novel, Homosexuality, Transgender, Psychology, Gay, Partition of India, Inequality, Economic Inequality, Social Problems, Sodomy.

کلیدی الفاظ: جدید ناول، جنسیت، ہم جنس پرستی، گے، ٹرانسجینڈر، سماجی حیثیت، نجی زندگی، نفسیات، لواطت، تقسیمِ ہند، جبر، عدم مساوات، معاشی مسائل

اشعر نجمی کا شمار اردو ادب کے معاصر اور اہم ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اب تک ان کے تین ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا پہلا ناول "اس نے کہا تھا" سنہ ۲۰۲۱ء میں فکشن ہاؤس، لاہور سے شائع ہوا۔ اشعر نجمی نے اپنے تمام ناولوں میں ایسے نازک اور حساس موضوعات کا انتخاب کیا ہے ؛جن پر لکھنا نہ صرف معاشرتی تنقید اور تضحیک کا باعث بن سکتا تھا، بلکہ بعض صورتوں میں قانونی کارروائی کا خدشہ بھی موجود تھا۔ ان تمام خطرات اور خدشات کے باوجود انھوں نے جرات مندانہ انداز میں ہم جنس پرستی جیسے اہم مگر متنازعہ موضوع کو اپنایا۔ اشعر نجمی نے ایک واضح موقف کے ساتھ معاشرتی حقائق کو بے نقاب کیا اور ان تلخ سچائیوں کو فکشن کے پیرائے میں پیش کیا، جو عموماً نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ ان کا یہ ادبی رویہ نہ صرف فکری جرات کی مثال ہے بلکہ اردو ناول کے دائرۂ موضوعات کو وسعت دینے کی ایک سنجیدہ کوشش بھی ہے۔

اشعر نجمی کا زیر نظر ناول "اس نے کہا تھا" اردو ادب کے جدید رجحانات کا عکاس ہے جس میں حساس اور غیر روایتی موضوعات کو جرات مندی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ ناول جنسی شناخت، ہم جنس پرستی، ٹرانس جینڈر، بچوں کے جنسی استحصال، طلاق یافتہ خواتین کی زندگی اور تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والے نفسیاتی اور معاشرتی مسائل جیسے اہم موضوعات پر مبنی ہے۔ مصنف نے انسانی نفسیات کی پیچیدگی، معاشرتی جبر اور عدم مساوات کو موثر پیرائے میں پیش کیا ہے۔ یہ ناول ان افراد کی آواز بن کر ابھرتا ہے، جنھیں اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے یا جن کے وجود سے انکار کیا جاتا ہے۔

ناول "اس نے کہا تھا" مجموعی طور پر اٹھائیس (۲۸) ابواب پر مشتمل ہے؛ جس کے ہر باب میں الگ الگ کہانی پیش کی گئی ہے۔ اس ناول کے اہم موضوعات میں ہم جنس پرستی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اشعر نجمی نے ہم جنس پرستی کو فرد کی جنسی شناخت کے ایک پہلو کے طور بیان کیا، اور اس میں ان افراد کی نفسی کیفیت اور معاشرتی ردعمل کا جائزہ لیا ہے۔ ہم جنس پرستی (Homosexuality) کی اصطلاح جدید سائنسی اور سماجی مطالعات میں مستعمل ہے، اور اس سے مراد وہ جنسی میلان ہے، جس میں افراد اپنی ہی صنف کی جانب کشش محسوس کرتے ہیں۔ ہم جنس پرستی کے حوالے سے

مروج اصطلاح "LGBTQ" ہے؛اس میں 'L' سے مراد لسبین ہے اور یہ ان خواتین کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو اپنی طرح دوسری خواتین سے جنسی لذت حاصل کرتی رہتی ہیں، 'G' سے مراد "گے" ہے، یہ ان مردوں کے لیے مستعمل ہے جو دیگر مردوں سے جنسی لذت حاصل کرتے ہیں۔ B' سے مراد بائیسیکشول ہے جس میں ایک مرد عورت اور مرد دونوں کے ساتھ جنسی روابط رکھتا ہے اور ان سے جنسی تسکین حاصل کرتا ہے۔ 'T' سے مراد ٹرانسجنڈر ہے، عموماً پیدائشی طور پر ہارمونز میں نقص کے سبب جنس تبدیل ہو جایا کرتی ہے اور ایسی جنس سامنے آتی ہے جو مرد اور عورت کے دائرے میں شمار نہیں کی جاتی۔ 'Q' سے مراد کوئیر یا سوال کرنے والے افراد ہوتے ہیں۔ اس تناظر میں ناول نگار نے مختلف کرداروں کے ذریعے ان اقسام کو معاشرتی، نفسیاتی، اور جذباتی زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ افراد ہیں جنھیں اکثر معاشرتی تعصب، استحصال اور تضحیک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اشعر نجمی ان کرداروں کو محض کہانی کا جزو نہیں بناتے بلکہ ان کے ذریعے وہ قاری کو اس مسئلے کی سنگینی اور اس سے جڑی پیچیدگیوں سے روشناس کراتے ہیں۔

دنیا کے مختلف معاشروں میں ہم جنس پرستی کے علاوہ ٹرانس جینڈر، لیسبئین اور 'گے' موجود ہوتے ہیں۔ اگر اس کی قدامت پر نظر کی جائے تو قدیم ترین تہذیبوں میں ایسے لوگوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ لہٰذا یہ عہدِ حاضر کی دین نہیں ہے۔ اس ضمن میں لوئیس کرومپٹن لکھتا ہے:

> "یونانی مذہب سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یونانی تصورات پر لواطت کا کتنا غلبہ تھا۔ اساطیر میں ہمیں پچاس سے زیادہ مثالیں ملتی ہیں جن میں دیوتاؤں کے معشوق لونڈے ہوتے تھے۔ شاعری اور مشہور روایات ایسے معاملات سے بھری ہوئی ہیں۔ شاعروں میں سیفو، الکے یوس، ابی کس، اناکرین، تھیوگنس، پنڈار اور لاتعداد خوش طبع لوگ جنھوں نے یونانی زبان میں دیوان چھوڑے ہیں۔ سب ہی نے ہم جنسی محبت کے گیت گائے ہیں۔ متعدد شہروں میں یونانی سیاسی رہنماؤں کی زندگیاں ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں جن کی نوعیت معمولی ہو یا اہم مگر ہم جنس پرستی کی شوق سے لبریز تھیں۔(۱)

جدید دور کے تناظر میں اس کی کڑی مغربی دنیا سے ملتی ہے۔ برطانیہ میں Gay liberation front یا (GLF) کے نام سے ایک تحریک کی ابتدا ہوئی۔ برطانوی حکومت کی سرپرستی میں سن ۱۹۷۱ میں 'لندن سکول آف اکنامکس' میں اس کا پہلا اجلاس ہوا۔ بعد ازاں اس تحریک کا نام (LGBT) رکھا گیا اور اس کی شناخت عالمی سطح پر اسی نام سے ہوئی اور دیگر ممالک میں اس کے اثرات سرعت کے ساتھ پھیلتے گئے۔

اشعر نجمی نے اپنے ناول میں یہ بات واضح کرنے کی سعی کی ہے، کہ مشرقی معاشرے میں ہم جنس پرست افراد کو عزت اور توقیر کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا اور مختلف صورتوں میں ان کا سماجی اور جنسی استحصال کیا جاتا ہے۔ ایسے افراد روحانی اذیت سے گزرتے ہیں۔ معاشرے میں ان پر عجیب عجیب جملے کسے جاتے ہیں۔ ہم جنس پرست جوڑے اس معاشرے میں آسانی سے زندگی بسر نہیں کر سکتے، اشعر نجمی سے پہلے اگر اردو ادب کا جائزہ لیا جائے تو کئی ادیبوں نے ہم جنس پرستی اور تیسری جنس کو موضوع بنایا ہے لیکن اشعر نجمی نے جس طرح کھل کر اسی موضوع پر لکھا ہے شاید کسی نے اس سے پہلے لکھا ہو۔

ناول کا ایک نہایت اہم موضوع ماضی ہے، جو بعض اوقات انسانی حال کو بھی متاثر کر کے اس کے سکون کو غارت کر دیتا ہے۔ اشعر نجمی نے جنسی جبلت کی عدم تکمیل کو ماضی کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ناول میں ماضی کے محض رومانوی یا عمومی صورت گری کی بجائے اسے جنسی خواہشات کی ناکامی یا الجھی ہوئی یادداشتیں، اور شدید ذہنی کشمکش کے ایک ہمہ جہت اور پیچیدہ مظہر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا

جائے تو اشعر نجمی کا بیانیہ قاری کو ماضی کے مختلف جہات میں لے جا کر ایک مخصوص نفسیاتی اور فکری فضا قائم کرتا ہے۔ اس حوالے سے ناول کے ایک قریب المرگ بیمار کردار کی باتیں ملاحظہ ہوں:

"ان میں سے کسی کا چہرہ مجھے یاد نہیں ہے، ہاں سب باتیں یاد ہیں۔ مجھے ہارون رشید اور جعفر برمکی کے چہرے یاد نہیں جو دو گریبانوں والے فرغل پہن کر ایک جان دو قالب بن جایا کرتے تھے۔ امین رشید کا چہرہ یاد نہیں لیکن اس کے بڑے بڑے سرین یاد ہیں جن کے درمیان فاصلہ تھا۔ مجھے معتصم کا بھی چہرہ یاد نہیں جو میرے ساتھ چوگان کھیلا کرتا تھا اور حمام میں ہم ایک دوسرے کے جسم رگڑا کرتے تھے "(۲)

ناول کے چوتھے باب میں جنسی استحصال کے تجربات سے دوچار افراد کی داخلی دنیا کو ایک گہرے فکری اور نفسیاتی تناظر میں برتا گیا ہے ۔ مصنف نے ان کرداروں کے ذہنی و جذباتی کرب کو محض بیانیہ سطح پر بیان کرنے کے بجائے اسے وجودی سطح پر محسوس کرانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کردار وہ ہیں جن کا معصوم بچپن، جنسی جارحیت کا نشانہ بنا، اور جن کی شناخت، شخصیت اور نفسیاتی ساخت پر اس جبر نے دیرپا نقوش چھوڑے۔ ان کے ماضی کے صدمات حال کی نفسیاتی الجھنوں میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں، اور یوں قاری ایک ایسی دنیا سے آشنا ہوتا ہے، جہاں تشدد محض جسمانی جبر نہیں بلکہ ایک دیرپا ذہنی و جذباتی آزار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ادبی اور نفسیاتی تنقید کے تناظر میں دیکھا جائے تو نجمی کا بیانیہ فرائڈین اور لاکانین نفسیات کے کئی پہلوؤں کی ترجمانی کرتا دکھائی دیتا ہے، جہاں لاشعور میں دبی ہوئی اذیتیں بار بار واپس آکر فرد کی شناخت کو منتشر کرتی ہیں، یہی منتشر شناختیں ناول کی کہانی میں نہ صرف درجہ بدرجہ آشکار ہوتی ہیں بلکہ وہ قاری کو استحصال زدہ افراد کے وجود میں پنہاں اس "خاموش چیخ" سے بھی روشناس کراتی ہیں، جو سماج کے عمومی بے حسی کے پس منظر میں گم ہوتی چلی جاتی ہے۔

اشعر نجمی نے نہایت فنی مہارت سے ان کرداروں کی داخلی کشمکش کو زبان دی ہے جس کے نتیجے میں ناول نہ صرف ایک بیانیہ احتجاج میں ڈھل جاتا ہے، بلکہ اسے ادبی، نفسیاتی اور سماجی مطالعات کے لیے ایک اہم متنی حوالہ بھی بنا دیتا ہے:

"مجھے وہ بھوری ڈاڑھی والا سفید مہاراشٹرین اب تک یاد ہے جس نے کہا تھا 'آئی واز ریپڈ۔۔۔ میرے خالو نے۔۔ بھالو جیسے بال ان کے جسم پر تھے۔۔ ایک ہی رات میں کئی بار۔۔۔ درد سے چیخ رہا تھا میں۔۔۔ نہ جانے کیوں کوئی سننے والا نہ تھا۔ پتہ ہے۔۔ ختم ہونے کے بعد اس حرامزادے نے کیا کہا تھا۔۔ اگلے بار اتنا درد نہیں ہو گا۔"(۳)

اس تناظر میں ناول کا دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو:

"میں ان سے ایک بار ملا بھی، برسوں بعد۔۔ بوڑھا ہو گیا تھا۔ بغیر دانت والا بھالو۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ بیمار ہے، عمر ہو گئی ہے، بھولنے لگا ہے۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو بھی نہیں پہچان پا رہا تھا۔ کسی نے اس کے کان میں چیخ کر کہا، دیکھو کون آیا ہے؟ للیتا کا چھوٹا بیٹا۔۔ فٹ بال کھیلنے جو ہمارے گھر آیا کرتا تھا" وہ مجھ سے نظریں نہ ملا سکا رونے لگا مادرچود۔"(۴)

گھر سے فرار ہو کر شادی کرنے کے واقعات مشرقی معاشروں میں کوئی غیر معمولی بات نہیں رہی۔ تاہم ان کا تاثر عمومی طور پر منفی تصور کیا جاتا ہے ایسے افراد کو عموماً معاشرتی اقدار سے انحراف کرنے والے اور رائج روایات کے خلاف بغاوت پر آمادہ سمجھا جاتا ہے۔ ناول نگار کے نزدیک اس

طرزِ عمل کی بنیاد اس وقت پڑتی ہے، جب فرد کو اپنی زندگی کے اہم فیصلوں، بالخصوص شادی جیسے حساس معاملے میں آزادانہ انتخاب کا اختیار نہیں دیا جاتا۔ جب ذاتی ارادے اور جذبات کو نظر انداز کر کے شخصی سماجی رسم و رواج کو ترجیح دی جائے، تو ایسے نوجوان یا تو ذہنی و جذباتی دباؤ کا شکار ہو کر خود کو نقصان پہنچانے لگتے ہیں یا گھر سے راہِ فرار اختیار کر کے اپنی مرضی سے شادی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ناول کے تیسرے باب میں اشعر نجمی اس سماجی مسئلے کو دو زاویوں سے پیش کرتے ہیں؛ ایک جانب وہ ایک ایسی خاتون کی کہانی بیان کرتے ہیں، جو رائج معاشرتی اقدار سے روگرداں ہے، جب کہ دوسری جانب نوجوان نسل کی اخلاقی و نفسیاتی زبوں حالی کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ اسی تناظر میں ایک شادی شدہ فرد کے گھر سے بھاگ کر شادی کرنے اور بعد ازاں اس کی پر اسرار موت کو سماج کے ہتک آمیز اور غیر انسانی رویے سے جوڑ کر دکھایا گیا ہے جو ایسے افراد کو زندگی کے کسی موڑ پر تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے:

> "ہمارے گھروں میں اکثر بولا جاتا تھا کہ بڑوں کی بات نہیں مانو گے تو اس جیسا حال ہو جائے گا پہلے یہ بات ہمارے چچا کے لیے بولی جاتی تھی جو کالج کی کسی لڑکی کے ساتھ فرار ہو گئے تھے اور کبھی لوٹ کر نہیں آئے۔ لیکن میرے گھر والوں کو لگتا تھا کہ آنٹی اب زیادہ ڈراؤنی مثال ہے اس لیے چچا کی جگہ اب آنٹی نے لے لی۔(۵)

معاشرتی اور مذہبی حوالے سے لواطت غلیظ اور شنیع فعل تصور کیا جاتا ہے۔ اکیسویں صدی میں ایسے واقعات سامنے آئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ سماج میں اس مکروہ فعل کے عادی لوگ اکثر بچوں کا جنسی استحصال کیا کرتے ہیں جس کے سبب بچوں کی نفسیاتی حالت پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بعض بچے اس قدر حساس ہوتے ہیں کہ جنسی استحصال کا ذکر کسی دوسرے شخص کے سامنے نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے ایسے بچے ذہنی کرب سے گزرتے ہیں۔ ناول کے چھٹے باب میں اشعر نجمی نے ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جو لواطت جیسے شنیع فعل میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لڑکوں سے قربت اور انس کی خاطر تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ اس باب میں ایک ایسے لڑکے کا تذکرہ ہے جو خزاں میں گھر کی چھت سے ملحقہ گھر میں دوسرے لڑکے کو دیکھتا ہے۔ جب درخت دیکھنے میں رکاوٹ بنتا ہے تو وہ مالک مکان سے شاخیں کاٹنے کی درخواست کرتا ہے۔ مالک مکان کے کہنے پر محکمہ اوقاف کو درخواست لکھتا ہے، جس پر عمل کر کے شاخیں کاٹ دی جاتی ہیں:

> "اس بار چھت والے لڑکے نے اسے ٹھیک سے دیکھا۔ وہ تقریباً اسی کی عمر کا تھا، چوڑے سرین والا۔۔اس کی رنگت اگرچہ بادلوں سی سانولی تھی لیکن اس کے چہرے پر غضب کی چکناہٹ تھی جس سے چھت والے لڑکے کی نظر بار بار پھسل جاتی تھی۔ آنگن والے لڑکے کے جسم کا اوپری حصہ برہنہ تھا۔ اس کے جسم پر بال تو در کنار، روئیں بھی ناپید تھے۔ چھاتیاں دو حصوں میں منقسم تھیں اور قدرے اُبھری ہوئی تھیں۔ اس نے نیچے تولیہ باندھ رکھا تھا۔ کمر سے کچھ زیادہ ہی نیچے تھا جس سے اس کی ریڑھ کا آخری سرا نظر آرہا تھا۔"(۶)

جدید اردو ناول میں فرد کی جنسی شناخت، اس کی نفسیاتی الجھنیں اور معاشرتی رویے ایک ایسا پیچیدہ مثلث تشکیل دیتے ہیں جس کا تجزیہ محض روایتی اخلاقی پیمانوں پر ممکن نہیں، زیرِ نظر ناول میں ہم جنس پرستی کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، وہ محض ایک جنسی عمل کا بیان نہیں بلکہ ایک گہرے نفسیاتی بحران اور سماجی جبر کا نمائندہ ہے۔ فرائڈ کے نظریات کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہم جنس کی کشش اکثر لاشعوری سطح پر ایسے تجربات یا

خواہشات سے جنم لیتی ہے جو بچپن میں دب چکی ہوتی ہیں یا جنھیں سماج کے خوف سے شعور کے پردے میں چھپا دیا گیا ہوتا ہے۔ناول کے کرداروں با لخصوص راوی اور سنجے کی جنسی رغبتیں دراصل ان کے اندرونی 'id' (نفس) کی ایسی آوازیں ہیں، جنھیں "super ego" (سماجی و اخلاقی خمیر) مسلسل دباتا رہا ہے۔ نتیجتاً، یہ خواہشات ایک بے چینی، اضطراب اور شناختی بحران کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

یہ نفسیاتی دباؤ ان کرداروں کو نہ صرف دوہری زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے بلکہ ان کی ازدواجی زندگی کو بھی شدید متاثر کرتا ہے۔ان کے لیے جنس محض جسمانی تسکین کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک جذباتی اور نفسیاتی سکون کی تلاش ہے، جو معاشرتی پابندیوں میں کہیں بھی نہیں ملتا۔اس دباؤ کا نتیجہ احساس گناہ، خود سے بیگانگی(Alienation)اور شدید ذہنی کشمکش کی صورت میں نکلتا ہے۔سماجی تنقید کے نقطہ نظر سے ناول میں جنسی رجحانات کے ساتھ معاشرے کے رد عمل کو بھی موضوع بنایا ہے۔ہمارا معاشرہ جنس اور شناخت جیسے موضوعات پر گفتگو کو ممنوع قرار دیتا ہے۔اس پابندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے افراد اپنی شناخت چھپانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور ایک ایسی زندگی گزارتے ہیں جو معاشرتی طور پر قابل قبول تو ہو سکتی ہے ،لیکن ذاتی سطح پر بے معنی اور پر عذاب ہوتی ہے۔

راوی اور سنجے جیسے کردار اس بات کی نمائندگی کرتے ہیں کہ سماجی ڈھانچے میں تنوع اور فطری اختلافات کو تسلیم نہ کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے، جب معاشرہ فرد کے فطری رجحانات کو معمول سے ہٹ کر سمجھتا ہے تو ایسے افراد یا تو خود کو مٹانے پر مجبور ہو جاتے ہیں یا پھر وہ دوہری شخصیت کا شکار ہو کر اندر ہی اندر ٹوٹتے چلے جاتے ہیں۔یہ صورت حال صرف فرد کا نہیں بلکہ مجموعی سماجی صحت اور ہم آہنگی کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔

ناول نگار نے بڑی مہارت سے اس المیے کی عکاسی کی ہے، کہ کس طرح سماجی تصورات، اخلاقی، مذہبی دباؤ اور خاندانی اقدار کے تحت افراد کو ان کی اصل شناخت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ان کرداروں کی ازدواجی زندگی کی ناکامی اور باہمی کشش اس امر کی علامت ہے کہ جذباتی اور جنسی شناخت کی نفی کرنے والا سماج صرف شکست خوردہ افراد ہی نہیں بلکہ غیر متوازن رشتے بھی پیدا کرتا ہے:

> "سنجے کو میر اوزڈم 'ٹیتھ' بہت پسند تھا۔لیکن اس کی بات الگ تھی۔اسے مجھ میں اور بھی بہت کچھ پسند تھا۔مجھے وہ بھی اچھا لگتا تھا، شاید یہی وجہ ہے کہ ہم نے ایک ساتھ کافی وقت گزارا۔"(۷)

ناول نگار کی نظر میں معاشرے اور خصوصا کالجوں اور ہاسٹلوں میں ہم جنس پرستی اور لیسبینزم کا کلچر عام ہوتا ہے اور اس کے خراب نتائج بسا اوقات شادی کرنے سے انکار کی صورت میں سامنے آتے رہتے ہیں۔

اشعر نجمی کے زیر بحث ناول میں "تیسری جنس" یعنی ٹرانس جینڈر کی زندگی اور ان کے مسائل کو ایک اہم اور سنجیدہ موضوع کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ناول نگار نے ان کرداروں کے ذریعے اس معاشرتی سچائی کو بے نقاب کیا ہے کہ تیسری جنس سے تعلق رکھنے والے افراد کو نہ صرف صنفی امتیاز کا سامنا ہے، بلکہ وہ معاشی، سماجی اور مذہبی سطح پر بھی مسلسل استحصال کا شکار ہیں۔یہ کردار محض تماش بین سماج کی تفریح کا ذریعہ بن کر رہ گئے ہیں، جہاں ان کی سماجی حیثیت کو تسلیم کرنے کے بجائے انھیں محفلوں کی رنگینی اور تفریح طبع تک محدود کر دیا جاتا ہے۔سماج کی اس منفی ساخت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ٹرانس جینڈر کے لیے معاشی خود مختاری حاصل کرنا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے۔کیوں کہ انھیں رسمی ملازمتوں، تعلیم اور پیشہ ورانہ ترقی کے مساوی مواقع میسر نہیں ہوتے۔ناول میں اس امر کو بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ یہ افراد جنسی استحصال، جسمانی تشدد اور حتیٰ کہ قتل جیسے جرائم کا نشانہ بنائے جاتے ہیں، جو نہ صرف انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے، بلکہ سماجی بے حسی اور عدم رواداری کا بین ثبوت بھی ہے۔مذہبی تناظر میں بھی ان کے

ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ بعض مذہبی عبادت گاہوں میں ان کے داخلے پر پابندی اس امر کی غماز ہے کہ ہماری معاشرتی اور مذہبی ساخت تیسری جنس کو مساوی انسانی حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں۔

یوں ناول نگار نے نہایت نہایت حساسیت سے اس تضاد کو اجاگر کیا ہے کہ ایک طرف ٹرانس جینڈر کو روحانیت سے منسلک کرنے کی تمنا کی جاتی ہے اور دوسری طرف انھیں مذہبی اجتماعات سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ ادبی سطح پر یہ بیانیہ محض اظہار نہیں بلکہ ایک احتجاج بھی ہے۔ ناول کا یہ پہلو اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ادیب نہ صرف مشاہدہ کرنے والا ہوتا ہے بلکہ وہ سماجی شعور کو بیدار کرنے والا ایک موثر وسیلہ بھی بنتا ہے۔ اشعر نجمی ٹرانس جینڈر کے ساتھ روا رکھے جانے والے سماجی جبر کو ناول کی صورت میں نمایاں کر کے معاشرتی رویوں پر نظر ثانی کی دعوتِ فکر دیتے ہیں:

> "معاشرے میں موجود دیگر معذور یا خصوصی افراد کے برعکس، ٹرانس جینڈر نہایت ذلت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ان کے پاس زندگی گزارنے کے لیے صرف تین ہی ذلت آمیز راستے ہیں پہلے نمبر پر مجرے اور رقص کر کے پیسے کمانا، دوسرے نمبر پر جسم فروشی اور تیسرے نمبر پر بھیک مانگ کر زندگی بسر کرنا۔ معاشرے میں انہیں تعلیم کا حق نہیں دیا جاتا۔"(۸)

اشعر نجمی کے اس ناول کے نویں باب میں "رنگیلی" ٹرانس جنڈر کردار کے ذریعے تیسری جنس سے وابستہ افراد کی زندگی کو درپیش سماجی ونفسیاتی مسائل کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ "رنگیلی" بچپن سے ہی والد کی نفرت اور سماجی جبر کا شکار (رہی) جب کہ تعلیمی ادارے بھی اس کے لیے تحفظ فراہم نہ کر سکے۔ اسے سکول میں جنسی استحصال کا سامنا کرنا پڑا، جس کے بعد وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ رنگیلی کی زندگی مسلسل محرومی، تشدد اور بے دخلی کا نمونہ بن کر سامنے آتی ہے۔ اس کی پر اسرار موت صرف ایک فرد کا المیہ نہیں، بلکہ ایک ایسے معاشرے کی علامت ہے جو ٹرانس جنڈر کو عزت دیتا ہے، نہ تحفظ، اور نہ ہی ان کی زندگی کو اہمیت دیتا ہے۔ ناول میں اس معاشرتی جبر کے حوالے سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "گھر چھوڑنے کے عذاب کے بعد میرے اوپر ایک اور عذاب نازل ہوا جس کے کرب نے میری روح تک زخمی کر دیا۔ چند شرفا گرو کے پاس آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے زبردستی بے لباس کیا اور اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا ڈالا۔ میں اتنا چھوٹا اور کمزور تھا کہ میں درد کی وجہ سے اپنے ہوش ہی کھو بیٹھا تھا۔ پھر اسی بے ہوشی کے عالم میں مجھے گرو کے حوالے کر دیا گیا۔"(۹)

اسی ظلم اور جبر کے حوالے سے دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ ہو:

> "اسکول ٹرپ پہ دو دنوں کے لیے نوادہ جانا تھا۔ میں بھی چلا گیا۔ ان دو دنوں میں میرے دوستوں نے باری باری میرا ابلاتکار کیا۔ ان دوستوں میں وہ ٹیچر بھی شامل تھے جو ہمیں نوادہ لے کر گئے تھے۔ خیر یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی اس لیے میرے دبلے پتلے جسم نے سب برداشت کر لیا، البتہ میری روح زخمی ہو گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب صرف موت ہی باقی ہے، کسی بھی وقت آ جائے۔"(۱۰)

زیر مطالعہ ناول میں ٹرانس جنڈر کے ساتھ روا رکھے جانے والے معاشرتی رویے کو گہرے دکھ اور تنقیدی شعور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ناول نگار کے مطابق تیسری جنس کے افراد دوہری بے دخلی کا شکار ہوتے ہیں۔ ایک طرف خاندان ان کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے، تو

دوسری جانب وسیع تر معاشرہ بھی ان کی شناخت، حقوق اور انسانی وقار کو نظر انداز کرتا ہے۔ یہ مسلسل انکار ان کی نفسیاتی الجھنوں، سماجی تنہائی اور معاشی محرومی کو جنم دیتا ہے۔ ناول ان مسائل کو اجاگر کر کے قاری کو اس صنفی و سماجی ناانصافی پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

مشرقی معاشروں میں طلاق یافتہ عورت موجود صنفی طاقت کے غیر مساوی نظام کی ثقافتی عکاسی ہے۔ کلچرل سٹڈی(cultural studies) کے زاویے سے دیکھا جائے تو ایسی عورت محض ایک سماجی کردار نہیں بلکہ ایک (cultural signifier)بن جاتی ہے جس پر معاشرہ اپنی اقداری بیانیے اور اخلاقی ضوابط مسلط کرتا ہے۔ بقول سید جلال الدین:

"مرد طلاق کے دو بول بول عورت کو بیک بنی و دو گوش گھر سے نکال کر باہر کر دیتا ہے اور وہ سوسائٹی میں بے یار و مددگار دربدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔"(۱۱)

زیر نظر ناول میں طلاق یافتہ خواتین کے گرد موجود جنسی استحصال کے پہلو کو نہایت بے باکی اور تنقیدی شعور کے ساتھ موضوع بنایا گیا ہے ۔ناول نگار نے اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے کہ مشرقی معاشرے میں طلاق یافتہ عورت نہ صرف سماجی تنقید و تحقیر کا نشانہ بنتی ہے، بلکہ اکثر اسے جنسی ہوس کا آسان شکار بھی تصور کیا جاتا ہے۔ ایسے کرداروں کے ذریعے یہ تو دکھایا گیا ہے کہ نوجوانوں سے لے کر ادھیڑ عمر اور بظاہر معزز افراد تک مختلف سماجی طبقات کے مردان خواتین کے جسموں کو محض تسکین نفس کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ صورت حال پدر شاہی طاقت کے اس ظالمانہ پہلو کو ظاہر کرتی ہے، جہاں عورت کی ازدواجی حیثیت کے خاتمے کو اس کی کمزوری یا "دستیابی" سمجھا جاتا ہے۔ ایسی خواتین کے ساتھ نہ ہمدردی برتی جاتی ہے نہ ان کی خود مختاری کو تسلیم کیا جاتا ہے بلکہ انھیں ایک خاموش اور مجبور وجود کے طور پر استحصال کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ناول سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"اور سب سے حد کرتے ہیں تم جیسے شادی شدہ لوگ؛ گنجے، موٹے، سرخ گالوں والے۔۔۔ جو میرے کپڑے اتارنے کے لیے گڑگڑاتے ہیں اور واپس کپڑا پہنتے وقت وہ یہ بولنا نہیں بھولتے کہ یہ ان کی آخری بار تھی۔"(۱۲)

اس ناول کے بارھویں باب میں انھوں نے ہاسٹلوں میں رہائش پذیر 'گے' افراد کا ذکر کیا ہے۔ ناول میں ایک طالب علم کی ہاسٹل روانگی کے وقت اس کے والد نے تلقین بھی کی کہ آپ کا روم پاٹنر "گے" نہ ہو؛ تاہم جب وہ ارجن سے متعارف ہوتا ہے تو اس کی اپنی جنسی کشش غیر ارادی طور پر بیدار ہونے لگتی ہے:

"اس کا نام ارجن تھا، قد کاٹھی میری طرح، سانولا۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا، اس لیے نہیں کہ وہ خوبصورت تھا بلکہ اس لیے کہ وہ 'وہ' تھا۔ یا اللہ! یہ کونسی آفت میرے کمرے میں آگئی۔ میرے کمرے میں میرا روم پاٹنر 'وہ' نکلا۔ اگر گھر میں پتہ چلا تو مجھے واپس بلا لیں گے۔ اپنا کمرہ بدلنے کے لیے مجھے عرضی ڈالنی ہو گی، جلدی، ابھی اسی وقت۔"(۱۳)

ناول میں ہم جنس پرست کرداروں کے ذریعے جنس، شناخت اور سماجی جبر کے پیچیدہ رشتے کو نہایت بے باکی سے پیش کیا گیا ہے۔ کردار ستیش کالج کے زمانے میں "گے" شناخت کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، مگر گاؤں واپس جانے کے بعد شادی سے گریزاں رہتا ہے، کیوں کہ اس کی جنسی رغبت عورتوں کی طرف نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایک اور کردار والد کے دباؤ پر شادی کے بندھن میں بندھنے سے قبل اپنی جنسی شناخت کے انکشاف کے

باعث گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ بیرون ملک مرد دوستوں کے ساتھ تعلقات میں رہتا ہے اور ہندوستان میں "گے رائٹس" سے متعلق قانون سازی کے بارہ برس بعد وطن واپس آتا ہے۔ اس کی واپسی پر خاندان کا ردعمل کچھ یوں ہوتا ہے:

"میری شادی ختم ہو چکی تھی۔ وہ لوگ زیادہ انتظار نہیں کر سکتے تھے، اپنی لڑکی کی شادی کسی اور کے ساتھ کرنے کو مجبور ہو گئے تھے۔ پاپا نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں واپس ادے پور آیا تو وہ مجھے تلوار سے چیر دیں گے۔ بھائی ضرور ایک بار فون پر بول چکا تھا کہ 'اب تو مرد بن جا، کب تک ماں کے دودھ کو شرماتا رہے گا۔"(۱۴)

یہ اقتباس کوئیر تھیوری کے تناظر میں اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ کس طرح روایت سماجی ڈھانچے غیر معیاری جنسی شناختوں کو مسترد کرتے ہیں اور انھیں "غیر مردانگی" سے تعبیر کرتے ہوئے سماجی بائیکاٹ، تشدد اور جذباتی ٹوٹ پھوٹ کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ یہاں جنس ایک حیاتیاتی حقیقت سے زیادہ ایک سماجی مطالبہ بن کر ابھرتی ہے جہاں "مرد بننے" کا دباؤ فرد کی اصل شناخت کو کچل دیتا ہے۔

ناول کے تیرہویں باب میں لیسبین رشتے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دو تعلیم یافتہ خواتین، رخسار، اور ریکھا نہ صرف جذباتی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، بلکہ جنسی طور پر بھی ایک مستحکم رشتہ قائم رکھتی ہیں۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی رہتا ہے جو اسکول میں طعنوں کا نشانہ بنتا ہے اور اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس کا والد کون ہے۔ ریکھا نے مصنوعی تولید کے ذریعے ماں بننے کا فیصلہ کیا جس کی وضاحت ناول میں یوں کی گئی ہے:

"میری ایک سینئر ڈاکٹر نے مدد کی۔ اس نے مجھے ایک چارٹ دکھایا جس میں ناموں کی جگہ صرف نمبر لکھے تھے، فوٹو بھی نہیں، انھیں میں سے ایک نمبر ۳۴۲ کا انتخاب کیا۔ اس کا قد چھ فٹ تین انچ تھا۔ جسم سڈول اور وہاں حیاتیات پر ریسرچ کر رہا تھا۔ صرف اتنی جانکاری موجود تھی۔ میری اس سینئر ڈاکٹر نے صرف اس کے دان کیے ہوئے اسپرم کو میرے اندر ڈال دیا اور تم میری کوکھ میں آ گئے۔"(۱۵)

یہ واقعہ جدید طب، جنسی خود مختاری اور متبادل خاندانی نظام کی نمائندگی کرتا ہے۔ کوئیر تھیوری کے تناظر میں یہ باب نہ صرف صنفی شناخت کے روایتی تصور کو چیلنج کرتا ہے، بلکہ اس پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ ریاستی قوانین، مذہبی بیانیہ اور معاشرتی اصول ایسے متبادل رشتوں کو اکثر غیر فطری، ممنوع اور ناقابل قبول گردانتے ہیں۔ اس تضاد کے باعث ایسے کردار سماجی، اخلاقی اور قانونی محاذوں پر یکساں دباؤ کا شکار ہوتے ہیں، جو ان کی شناخت اور وجود کے بحران کو مزید شدید کر دیتا ہے۔

ناول میں رخسار اور ریکھا نہ صرف لیسبین رشتے میں بندھی ہوئی ہیں بلکہ وہ سماجی سطح پر بھی اپنی شناخت اور قانونی حیثیت کے لیے سرگرم عمل نظر آتی ہیں۔ وہ ہم جنس پرستوں کی شادی کو قانونی حیثیت دینے کے حق میں احتجاجی تحریک کا حصہ بنتی ہیں اور جب قانون نافذ ہو جاتا ہے تو باقاعدہ طور پر شادی کر لیتی ہیں۔ مصنف اس لمحے کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"رجسٹرار کے دفتر میں ممی اور ماں نے دستخط کیے۔ رخسار ممی اور ریکھا ماں نے ایک دوسرے کی انگلی میں انگوٹھی پہنائی، وہاں کھڑے سبھی لوگوں نے تالیاں بجا دیں۔ ممی اور ماں نے سب کے سامنے ایک دوسرے کا بوسہ لیا۔ لوگوں نے ان پر پھولوں کی پتیاں پھینکنی شروع کر دیں۔"(۱۶)

یہ منظر نہ صرف ہم جنس پرست رشتوں کی قانونی قبولیت کا مظہر ہے بلکہ اس بات کی علامت بھی ہے کہ جب قانون ساتھ دے تو وہ رشتے جو ماضی میں چھپ کر جیے جاتے تھے، اب اعلانیہ اور باوقار انداز میں معاشرتی منظر نامے کا حصہ بن سکتے ہیں۔ یہ واقعہ ریاستی قانون، انفرادی اختیار اور محبت کی سیاسی حیثیت کو باہم مربوط کرتا ہے۔

ناول کے چودھویں اور پھر پندرھویں باب میں مصنف نے ایک اور اہم معاشرتی حقیقت کا پردہ چاک کرنے کی سعی کی ہے۔ اس میں انھوں نے چھوٹے بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کرنے والے افراد کا کریہہ چہرہ پیش کیا ہے۔ ایک بچے کا کردار اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے جو اپنا ٹی وی نہ ہونے کی صورت میں پڑوس کے گھر میں ٹی وی دیکھنے جاتا ہے لیکن وہاں ایک شخص اس کا جنسی استحصال کرتا ہے۔ ناول میں اشعر نجمی اس کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

> "میں اکثر پڑوس میں 'شکتی مان' دیکھنے چلا جایا کرتا تھا۔ اس گھر میں ایک ۲۵ سال کا لڑکا تھا۔ وہ پہلے میرے انڈرویئر میں ہاتھ ڈال کر میرا عضو تناسل پکڑتا اور پھر اپنا عضو تناسل مجھے پکڑا کر جلق لگواتا۔ اگر میں ایسا کرنے سے کبھی انکار کر دیتا تھا۔ شکتی مان میرا فیوریٹ شو تھا، اتنا پسند تھا کہ مجھے اس کے لیے یہ قربانی دینی ہی پڑی تھی۔"(۱۷)

مصنف کے مطابق جائنٹ فیملی سسٹم میں ایسے واقعات عموماً رونما ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن جھجک اور بدنامی کے خوف سے بچے اس کا تذکرہ کسی کے سامنے کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس تناظر میں دوسرا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "میرے دو چچیرے، جن کی عمر اس وقت ۱۷۔۱۸ سال رہی ہو گی، مجھے جگانے کے لیے آئے، انھوں نے کہا کہ میری ماں نے مجھے بلایا ہے۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئے۔ میں نے ان سے ماں بلانے کے لیے کہا تو ایک نے اٹھ کر مجھے دبوچ لیا اور میرے نیکر کو نیچے کھینچ دیا۔ میں زور زور سے ماں کو آواز دینے لگا۔ ایک نے میرے ننگے چوتڑ پر اپنا عضو تناسل رگڑنا شروع کر دیا اور دوسرا اپنا عضو تناسل میرے منہ میں ڈالنے کی کوشش کرنے لگا۔"(۱۸)

تقسیم ہند کے نتیجے میں جو انسانی المیے رونما ہوئے، ان کے اثرات صرف جسمانی اور جغرافیائی سطح تک محدود نہیں رہے، بلکہ ان کے گہرے نقوش متاثرہ افراد کی نفسیات، جذبات اور معاشرتی شناخت پر بھی مرتب ہوئے۔ زیر مطالعہ ناول میں مصنف نے ان ہی نفسیاتی کیفیت اور جذباتی زخموں کو بھی موضوع بحث بنایا ہے جو تقسیم کے بعد پیدا ہونے والی کشیدگی، نقل مکانی اور بچھڑ جانے والے رشتوں سے جنم لیتی ہیں۔ مصنف اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ تقسیم کے اندوہ ناک تجربات کی شدت وہی لوگ مکمل طور پر محسوس کر سکتے ہیں، جن کے خاندان، رشتے، تہذیب اور محبتیں اس سانحے کی نذر ہو چکی ہوں:

> "سوچ رہا ہوں اس سال ۱۴ اگست کو دادی کی قبر پر جاؤں اور ان سے پوچھوں کہ ہم جہاں سے آئے تھے، آخر واپسی کے راستے ہم پر کیوں بند کر دیے گئے؟ ہم وہاں رہ جاتے تو کیا ہوتا؟ اور اب جو آ گئے ہیں تو کیا ہوا ہے؟ کتنے سارے سوال ہیں جو میں دادی سے پوچھنا چاہتا ہوں لیکن وہ بیچاری کیسے ان کا جواب دے پائیں گی، وہ تو منوں مٹی تلے ابدی نیند سو رہی ہیں۔"(۱۹)

یہاں دادی کی قبر کے استعارے کو استعمال کر کے مصنف نے اس خاموش تاریخ کو بیان کیا ہے، جو زندہ کرداروں کی زبانی بیان نہیں ہو پائی۔ کردار کے سوالات دراصل ایک پوری بے چینی، تشویش اور اپنوں سے بچھڑ جانے کا اجتماعی نوحہ ہے۔

ناول کے بیسویں باب میں اشعر نجمی نے مرضی کے خلاف شادی جیسے اہم اور حساس سماجی مسئلے کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ فریدہ اور اس کے محبوب کے درمیان گہرا تعلق قائم ہو چکا تھا، لیکن خاندان کی طرف سے روایتی اور جبری رویوں کے تحت اس کی شادی کسی اور مرد سے کرائی جاتی ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں محبت کرنے والے دونوں کردار شدید جذباتی کرب اور نفسیاتی اذیت سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ مصنف نے محبوب کی جدائی اور زبردستی کی شادی کے بعد پیدا ہونے والی جذباتی کیفیت کو نہایت دردناک انداز میں بیان کیا ہے۔ کردار اپنے گہرے صدمے کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> "میری آنکھ کب بند ہوئی، پتہ نہیں چلا۔ جب ہوش آیا تو میں سرد شبنم میں میں بھیگ چکا تھا۔ ادھ کھلی آنکھوں سے میں نے اس کا نکاح دیکھا جسے میں نے کبھی قبول نہیں کیا، پھر بھی وہ میری تھی۔ یا شاید یہ میرا وہم تھا۔ صبح کا اجالا چاروں طرف بکھرنے لگا۔ رخصتی کی تیاری ہو رہی تھی۔"(۲۰)

یہ اقتباس نہ صرف ایک انفرادی دکھ کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اس کے ذریعے مصنف نے اس سماجی جبر کو بھی نمایاں کیا ہے جو فرد کی ذاتی پسند، جذبات اور آزادی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی زندگی کے فیصلے اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ کردار کی ٹوٹ پھوٹ، اس کی بے بسی اور اس کا داخلی اضطراب ایک اجتماعی سچائی کی نمائندگی کرتا ہے، جو آج بھی کئی معاشروں میں موجود ہے۔ ناول نگار نے یہاں جذباتی گہرائی اور علامتی زبان کے ذریعے قاری کو نہ صرف متاثر کیا ہے، بلکہ اسے سوچنے پر بھی مجبور کیا ہے کہ محبت اور مرضی کی شادی کے حق کو نظر انداز کرنا کس قدر تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

اشعر نجمی کا ناول "اس نے کہا تھا" ایک کثیر الجہتی ادبی کاوش ہے، جس میں مصنف نے نہ صرف فرد کی داخلی کشمکش، جذباتی پیچیدگیوں اور سماجی جبر کو موضوع بنایا ہے، بلکہ عصر حاضر کے چند اہم اور حساس سماجی مسائل کو بھی مہارت، جرات اور فکری گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ناول کے آخری ابواب میں مصنف 'قاری' معاشرے اور قانون سے براہ راست سوال کرتے ہیں کہ جب ریاست نے LGBTQ افراد کو قانونی شناخت اور حقوق عطا کر دیے ہیں، تو عام سماجی رویے ان افراد کے بارے میں اب تک منفی، توہین آمیز اور امتیازی کیوں ہیں؟ اشعر نجمی اس تضاد کو بے نقاب کرتے ہیں کہ معاشرہ ایسے افراد کو اگرچہ قانونی سطح پر قبول کر چکا ہے، مگر روزمرہ زندگی میں انھیں اب بھی تحقیر، تنقید اور نفرت کا سامنا ہے۔ مصنف نے ہم جنس پرستوں، ٹرانس جنڈر اور دیگر صنفی اقلیتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویوں پر گہری تنقید کی ہے۔ وہ اس تصور کو واضح کرتے ہیں کہ جنس ایک حیاتیاتی حقیقت ہے، جس پر فرد کا اختیار نہیں، لہٰذا اس بنیاد پر کسی کو مجرم یا کمتر سمجھنا غیر منصفانہ اور غیر انسانی رویہ ہے۔ ناول میں ان افراد کی زندگی کو درپیش معاشرتی اور نفسیاتی مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے، اور اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ یہ افراد معاشرے کے فعال اور مفید شہری بننے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں، بشرطیکہ انھیں برابری کا حق اور احترام دیا جائے۔

علاوہ ازیں، اشعر نجمی نے ناول میں بچوں کے جنسی استحصال جیسے حساس موضوع پر بھی توجہ دی ہے۔ انھوں نے اس کے منفی نفسیاتی و جذباتی اثرات کو نہایت باریک بینی سے بیان کیا ہے، جس سے قاری کو اس سنگین مسئلے کا شدت سے اندازہ ہوتا ہے، زبردستی کی شادی اور مرضی کے

خلاف رشتہ طے کرنے جیسے روایتی جبر کے نقصانات بھی ناول کا اہم موضوع ہے، جسے مصنف نے فرد کے ذاتی انتخاب اور آزادی کو ایک بنیادی انسانی حق کے طور پر پیش کیا ہے۔

مزید بر آں، ناول میں تقسیم ہند جیسے اجتماعی المیے کو بھی شامل کیا گیا ہے، جو تاریخی سانحہ ہونے کے ساتھ ساتھ فرد کی شناخت، یادداشت اور جذبات سے جڑا ہو مسئلہ بھی ہے۔ اس طرح اشعر نجمی کا یہ ناول فرد، معاشرہ اور ریاست کے باہمی تعلق، شکست و ریخت اور امکانات کا ایک جامع اور فکری مطالعہ فراہم کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ لویس کرومپٹن "عالمی تہذیبیں اور ہم جنس پرستی" مترجم، محمد مظاہر، ۱۹۷۸، ص ۱۳

۲۔ اشعر نجمی، ناول "اس نے کہا تھا" (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۱ء) ص ۱۶

۳۔ ایضا ص ۲۵

۴۔ ایضا ص۔ ۲۵

۵۔ ایضا، ص ۲۰

۶۔ ایضا، ص ۴۰

۷۔ ایضا، ص ۱۵۳

۸۔ حوالہ:.Al.Absar research (journal of fiqah and Islamic studies) University of Bahawalpur خواجہ سراء اور LGBTQ میں فرق۔ محمد طاہر اکبر، دسمبر، ۲۰۰۲ء

۹۔ اشعر نجمی، ناول "اس نے کہا تھا"، ص ۷۶

۱۰۔ ایضا ص ۷۷۔

۱۱۔ سید جلال الدین، مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ (علی گڑھ: ادراہ تحقیق و تصنیف اسلامی، ۱۹۹۴) ص ۱۱۹

۱۲۔ اشعر نجمی، ناول "اس نے کہا تھا"، ص ۸۸

۱۳۔ ایضا ص ۸۲

۱۴۔ ایضا، ص ۲۰۵

۱۵۔ ایضا ص ۱۰۱

۱۶۔ ایضا، ص ۱۱

۱۷۔ ایضا ص ۱۱۵

۱۸۔ ایضا ص ۴۴

۱۹۔ ایضا، ص ۱۳۰

۲۰۔ ایضا، ص ۱۵۹